www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تنکوں کا دوپٹہ

نیلوفر سیّد کے نام

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ٹوٹا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ
تڑپا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

کہتا نہیں کسی سے مگر جانتے ہیں ہم
رویا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

پھیلا کے اپنے گرد تصاویر اور خطوط
بکھرا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

راتوں کی سائیں سائیں میں تنہائیوں کے بیچ
جاگا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

دہلیز پر پرانے زمانوں کا منتظر
بیٹھا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

اٹھتے قدم ہماری طرف روکتے ہوئے
اُلجھا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

ہر زخم کا علاج مسیحائی میں نہیں
سمجھا ضرور ہو گا بچھڑنے کے بعد وہ

کسی کشش کے کسی سلسلے کا ہونا تھا
ہمیں بھی آخرش اِک دائرے کا ہونا تھا

ابھی سے اچھا ہوا رات سو گئی ورنہ
کبھی تو ختم سفر رت جگے کا ہونا تھا

برہنہ تن بڑی گزری تھی زندگی اپنی
لباس ہم کو ہی اک دوسرے کا ہونا تھا

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

ہم اپنا دیدۂ بینا پہن کے نکلے تھے
سڑک کے بیچ کسی حادثے کا ہونا تھا

ہمارے پاؤں سے لپٹی ہوئی قیامت تھی
قدم قدم پہ کسی زلزلے کا ہونا تھا

ہم اپنے سامنے ہر لمحہ مرتے رہتے تھے
ہمارے دِل میں کسی مقبرے کا ہونا تھا

تم آ سکے نہ شبِ قدر کے اجالے میں
وگرنہ وصل بڑے مرتبے کا ہونا تھا

تمام رات بلاتا رہا ہے اِک تارہ
اُفق کے پار کسی معجزے کا ہونا تھا

کسی کے سامنے اٹھی نظر تو بہہ نکلا
ہماری آنکھ میں کیا آبلے کا ہونا تھا

یہ کیا کہ ساتھ ازل سے ہے ہمسفر منزل
کسی جگہ تو کسی مرحلے کا ہونا تھا

ہم اپنے شہر سے باہر نکل ہی آئے ہیں
کبھی ہمیں بھی کسی راستے کا ہونا تھا

اِک دِل میں تھا اِک سامنے دریا اُسے کہنا
ممکن تھا کہاں پار اُترنا اُسے کہنا

ہجراں کے سمندر میں ہیولا تھا کسی کا
اِمکاں کے بھنور سے کوئی اُبھرا اُسے کہنا

اِک حرف کی کرچی کہیں سینے میں چُبھی تھی
پہروں تھا کوئی ٹوٹ کے رویا اُسے کہنا

مدت ہوئی خورشید گہن سے نہیں نِکلا
ایسا کہیں تارا کوئی ٹوٹا اُسے کہنا

جاتی تھی کوئی راہ اکیلی کسی جانب
تنہا تھا سفر میں کوئی سایا اُسے کہنا

ہر زخم میں دھڑکن کی صدا گونج رہی تھی
اِک حشر کا تھا شور شرابا اُسے کہنا

مجھ کو اتار حرف میں ، جانِ غزل بنا مجھے
میری ہی بات مجھ سے کر، میرا کہا سنا مجھے

زخمِ بدِ خرام کی تھمتی نہیں ہیں بجلیاں
صبحِ ازل نژاد سے کرنا ہے مشورہ مجھے

لوحِ جہاں سے پیشتر لکھا تھا کیا نصیب میں
کیسی تھی میری زندگی ، کچھ تو چلے پتہ مجھے

کیسے ہوں خواب آنکھ میں ، کیسا خیال دل میں ہو
خود ہی ہر ایک بات کا کرنا تھا فیصلہ مجھے

چھوٹے سے اک سوال میں دن ہی گزر گیا مرا
تُو ہے کہ اب نہیں ہے تُو بس یہ ذرا بتا مجھے

ہے پل صراطِ وقت سے کیسے گزرنا اب مجھے
ویسے تو دے گئے سبھی جاتے ہوئے دعا مجھے

میرا سفر مرا ہی تھا اٹھتے کسی کے کیا قدم
اپنے لئے تھا کھوجنا اپنا ہی نقشِ پا مجھے

لگتا ہے چل رہی ہوں میں روحِ تمام کی طرف
جیسی تھی ابتداء مجھے ویسی ہے انتہا مجھے

کسی کے ساتھ کیا نسبت ہوئی تھی
میں اپنے آپ سے رخصت ہوئی تھی

پلٹ کے پیچھے دیکھا تھا ذرا سا
مجھے خود پر بڑی حیرت ہوئی تھی

اچانک آگئی تھی اپنے آگے
اچانک بات کی جرات ہوئی تھی

خود اپنا ساتھ بھی چُبھنے لگا تھا
عجب تنہائی کی عادت ہوئی تھی

مرے اندر بھنور اٹھنے لگے تھے
سمندر سے بڑی وحشت ہوئی تھی

بہت سر گوشیاں شیشے سے کی تھیں
کسی کی مجھ سے بھی غیبت ہوئی تھی

یہ کمرہ اور یہ گرد و غبار اُس کا ہے
وہ جس نے آنا نہیں اِنتظار اُس کا ہے

رُکی ہوں زخم کے رقبے میں اپنی مرضی سے
یہ جانتی ہوں کہ قرب و جوار اُس کا ہے

کسی خسارے کے سودے میں ہاتھ آیا تھا
سو ایک قیمتی شے میں شمار اُس کا ہے
فقط فراق تو اِتنا نشہء نہیں رکھتا
میں لڑکھڑائی ہوں جس سے خُمار اُس کا ہے

خرید سکتی تھی سو میں خرید لائی ہوں
وہ میرے پاس ہے چاہے ہزار اُس کا ہے

دریدہ جاں ہوں ، دریدہ لباسیاں بھی ہیں
مگر یہ کم تو نہیں تار تار اُس کا ہے

میں سینت سینت کے کِتنا سمیٹ کر رکھوں
کہ کائنات بھرا اِنتشار اُس کا ہے

نجانے بولتی رہتی ہوں نیند میں کیا کیا
جو نام سُنتی ہوں میں بار بار اُس کا ہے

میں گھر سے جاؤں تو تالا لگا کے جاتی ہوں
کچھ اُس کی شہرتیں، کچھ اعتبار اُس کا ہے

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عجب اک تازیانہ ہو گیا ہے
بدن اپنا پرانا ہو گیا ہے

کوئی لمحہ رکا ہے آئینے میں
کہیں ٹھہرے زمانہ ہو گیا ہے

کسی تنکے سے چھت کا کام لے کر
ہمارا بھی ٹھکانہ ہو گیا ہے

ذرا سا کام جو تم نے کہا تھا
کہا نا ، کہہ دیا نا ، ہو گیا ہے

ہماری آنکھ کا یہ سرخ کنکر
سحر کا شاخسانہ ہو گیا ہے

کسی کے ہونے کا کچھ آسرا تھا اچھا تھا
اس آگہی سے تو آنکھوں پہ پردہ اچھا تھا

مجھے پسند تھا ہر جھوٹ اس کے ہونٹوں سے
وہ سچ نہ بولتا مجھ سے تو کتنا اچھا تھا

میں ایک پل کیلئے اس کے پاس ٹھہری تھی
سجا ہوا تھا قرینے سے کمرہ اچھا تھا

وہ ایک خواب جو مسلوب ہو گیا مجھ سے
وہی تو پاس تھا لے دے کے، کیسا اچھا تھا

ہمارے دل کی زمینیں چیخ بھی سکتی تھیں
میں اک چٹان تھی ، پتھر سے ملنا اچھا تھا

مجھے تو اب بھی وہ ظالم برا نہیں لگتا
کسی کا ہو گیا ویسے ہی ، دل کا اچھا تھا

رہے گا مجھ کو تاسف پلٹ کے آنے کا
لپٹ رہا تھا جو پاؤں سے رستہ اچھا تھا

وہ لوٹ آتا تھا مجھ سے نکل کے آگے بھی
جو میرے ساتھ سفر میں تھا ، سایہ ، اچھا تھا

تمام عمر کا اک زندہ گھاؤ تھا کوئی
وہ میرے ساتھ بھڑکتا الاؤ تھا کوئی

بڑی ہی خشک پہاڑی تھی دور تک لیکن
ہر اک چٹان میں تازہ کٹاؤ تھا کوئی

لگی نہ آنکھ کبھی پھر وہ خواب تھا ایسا
کہیں کچھ ہونے کا ذہنی دباؤ تھا کوئی

سلگتی راکھ ہوا میں دُہائی دیتی تھی
ذرا سی دیر کا کیسا پڑاؤ تھا کوئی

ہم اس کو چھوڑ کے آگے نکل گئے ، جیسے
کبھی کے ساتھ اضافی سا واؤ تھا کوئی

عجیب ریلا تھا ہم ریت ہو گئے جس میں
ہماری آنکھ میں کیسا بہاؤ تھا کوئی

قدم اٹھانے سے پہلے سفر میں ہار گئے
لگا ہوا کسی منزل پہ داؤ تھا کوئی

کبھی کبھی ہمیں کھڑکی بلا ہی لیتی ہے
ہماری عمر کا پہلا لگاؤ تھا کوئی

چٹائی ہے سمیٹی جا رہی ہے
زمیں میری لپیٹی جا رہی ہے

مسافت جستجو ہے اور منزل
مرے پاؤں میں لیٹی جا رہی ہے

گنہ کا بوجھ ہے نیکی کے سر پر
کوئی چادر سلیٹی جا رہی ہے

ہوا بھیگی ہوئی ہے سسکیوں سے
کسی گاؤں سے بیٹی جا رہی ہے

دبائی جائے گی زندہ زمیں میں
کہاں قسمت کی ہیٹی جا رہی ہے

کیا وہ دعا کی آخرِ شب آن بان تھی
ہاتھوں پہ آفتاب صفت سی اٹھان تھی

اِک رات کا سفر جسے بوڑھا بنا گیا
لڑکی وہ شام تک تو بڑی نوجوان تھی

تنکے کچھ آشیاں کے دوپٹے میں رہ گئے
چڑیا کی اپنے گھر سے یہ پہلی اڑان تھی

مت سوچ تیر کیسے ہدف سے پلٹ گیا
تُو جس کی زد پہ آیا تھا ، میری کمان تھی

جس کی کہانیاں تھیں زبانوں کے شہر میں
وہ آنکھ دیکھنے میں بڑی بے زبان تھی

پانی میں گھل رہی تھیں پہاڑوں کی سرخیاں
ساحل پہ ایک موج گزیدہ چٹان تھی

فقط دو چار ہی تو ثانیے تھے
مگر وہ کام جو ہم نے کیے تھے

ہمارے درد میں شدت وہی ہے
ذرا تم آ گئے تو ہنس دیئے تھے

دہن میں حرف زخمی ہو گئے ہیں
بڑی مشکل سے اپنے لب سیئے تھے

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

کسی کا خط تو آ سکتا تھا اک دن
گلی کوچوں میں کتنے ڈاکیے تھے

یہ آنکھیں ضبط سے صحرا ہوئی ہیں
سمندر در سمندر پی لئے تھے

ہمیں ملتے تو یہ بھی یاد رکھتے
کہ اپنے ساتھ ہم برسوں جیئے تھے

دراڑیں پڑ گئی تھیں اور مراسم
سسکتے تھے کہ جیسے مرثیے تھے

کوئی آہٹ دھڑکتی ہی نہیں تھی
خموشی تھی ، اندھیرا تھا ، دیئے تھے

دھوئیں سے اور گہرے ہو گئے ہیں
سلگتی حسرتوں کے المیے تھے

نہ اعتماد شکستہ ایاغ کا کوئی
نہ ظرف چشمہ ء جاں کے سراغ کا کوئی

یہ انتقام بھی دیکھا ہوا کے جھونکے نے
گرا کے تیل گیا ہے چراغ کا کوئی

ورق ورق پہ سیاہی انڈیلنے کے بعد
حساب کرنے لگا داغ داغ کا کوئی

ہر اک خواب میں سوکھا شجر دکھائی دے
نچوڑ لے گیا رس ہی دماغ کا کوئی

ذرا سے خوف کی تلوار فیصلہ کن تھی
قفس کا ہو گیا کوئی تو باغ کا کوئی

وہ رات مجھ پہ قیامت تھی تم نہیں آئے
بہت تمہاری ضرورت تھی تم نہیں آئے

اک آسمان گرا تھا زمین پر لیکن
ذرا سی دیر مصیبت تھی تم نہیں آئے

وہ جاتے جاتے بھی اپنے کواڑ کھول گئی
تمام عمر کی حسرت تھی تم نہیں آئے

بلائیں سر کو پٹختی تھیں کھڑکیوں سے مری
عجیب خواب میں دہشت تھی تم نہیں آئے

بہت سے پھول بکھیرے تھے راہ داری میں
بڑی طویل مسافت تھی تم نہیں آئے

اک آنکھ چیرتی رہتی تھی رات کا دامن
وہ انتظار کی وحشت تھی تم نہیں آئے

مکان اپنا بدل کر چلی گئی آخر
کہ جب بہار کو فرصت تھی تم نہیں آئے

اب آئے ہو کہ بدن مانگتا نہیں کچھ بھی
جب اپنے درد میں شدت تھی تم نہیں آئے

مایوسیوں سے ہر سر پیکار ایک ساتھ
مصلوب ہو گئے کئی پندار ایک ساتھ

اک دل کے ٹوٹنے کی تھی تفتیش روبرو
دونوں طرف تھا جرم سے انکار ایک ساتھ

پُر پیچ راستے تھے مسافت طویل تھی
ہونے لگے تو ہو گئے ہموار ایک ساتھ

آشوبِ چشم ، رتجگے ، آنسو ، سیاہیاں
اُترے ہوئے ہیں آنکھ میں آزار ایک ساتھ

تیشہ بکف تھا دونوں طرف جذبۂ وصال
ہم نے گرائی ہجر کی دیوار ایک ساتھ

کچھ آنسوؤں کی آگ تھی ، کچھ آہِ آتشیں
مجروح ہو گئے لب و رخسار ایک ساتھ

زخم سینے میں ہے، جال اس کے علاوہ بھی ہے
جاں بلب تیرا غزال اس کے علاوہ بھی ہے

شام کی قبر میں مرتے ہوئے سورج کو نہ دیکھ
زندگی رو بہ زوال اس کے علاوہ بھی ہے

ایک تو چاکِ گریباں ہے مری روح تلک
ایک اشکوں جڑی شال اس کے علاوہ بھی ہے

اک برس وہ تھا جو دنیا کی نظر میں گزرا
ایک بیتا ہوا سال اس کے علاوہ بھی ہے

صرف اک وصل کی پابند نہیں ہے نسبت
تجھ سے وابستہ خیال اس کے علاوہ بھی ہے

میں فقط پا بہ سلاسل ہی نہیں رقص کناں
پاؤں میں ایک دھمال اس کے علاوہ بھی ہے

خواب کھو دینے کا دکھ اپنی جگہ ہے لیکن
شب گزیدہ کا ملال اس کے علاوہ بھی ہے

یوں تو ہر حرف کے پتھر نے اسے توڑا ہے
دل کے آئینے میں بال اس کے علاوہ بھی ہے

دل میں موجود ہے تُو داغ کی صورت لیکن
ہجر میں ایک وصال اس کے علاوہ بھی ہے

اِک مرا پوچھتی ہے میری پریشاں حالی
اِک مرا خود سے سوال اس کے علاوہ بھی ہے

کچھ تو اس ذات کے پیوند ابھی باقی ہیں
کچھ محبت کا وبال اس کے علاوہ بھی ہے

میں بھی ہوں اور چناروں کا سلگتا پن بھی
تیرے ہونے کی مثال اس کے علاوہ بھی ہے

یہ کوئی کم تو نہیں نقش تہہِ آب ہوئے
بہتے دریا کا کمال اس کے علاوہ بھی ہے

بے گھری بھی ہے ، صعوبت بھی ، سفر بھی ہے نیا
اک مگر عرصہء حال اس کے علاوہ بھی ہے

میری پہچان رکھا درد کا دھبہ تُو نے
خالی تصویر میں رہنے دیا چہرہ تُو نے

تیری آواز مرے کان سے جاتی ہی نہیں
بھول جاؤں تجھے اِک روز کہا تھا تُو نے

رات چمنی سے لگا تھا کوئی امید کا چاند
دیکھ کھولا ہی نہیں اپنا دریچہ تُو نے

دل کے کمرے میں کہیں کوئی کمی آج بھی ہے
جانے کس حسنِ تناسب سے سجایا تُو نے

روز گرتے ہیں ترے ہاتھ سے گھر کے برتن
زندگی جینے کا سیکھا نہ قرینہ تُو نے

کیوں مجھے عکس پسِ عکس مسافت بخشی
آئینہ کیوں مجھے ہر آن دکھایا تُو نے

عذابِ آتشِ ہجراں کو سہنے لگتی ہوں
پگھل پگھل کے تری سمت بہنے لگتی ہوں

نہ جانے گھر کسے کہتے ہیں اور مکان ہے کیا
کبھی کبھی تو میں تجھ میں ہی رہنے لگتی ہوں

تری گلی میں یہی ہم کلام ہے مجھ میں
سو گردِ راہ سے ہر بات کہنے لگتی ہوں

چلا بھی آ کہ تجھے اوڑھ کر لباس کروں
برہنہ تن پہ ترا نام پہنے لگتی ہوں

ترے خیال کی برسات کے تصور سے
میں ایک کچی حویلی ہوں ڈھنے لگتی ہوں

کچھ یاد آ رہا تھا یہ کس کا کہا ہوا
خاموش ساعتوں میں بہت شور سا ہوا

زندہ ابھی تلک تھا کوئی حرفِ اعتبار
یہ کون لاشعور میں ہم سے جُدا ہوا

محرومیوں کا ایک سمندر تھا سامنے
تنکا دِکھائی دیتا تھا کشتی بنا ہوا

آنکھوں کی خشک ریت سرابوں سے بھر گئی
بہنے لگا ہے یاد کا چشمہ رُکا ہوا

بستر میں انتظار کی شکنیں پڑی رہیں
وہ نیند کا گزر کہ جو ہونا تھا کیا ہوا

اِک موم کا نگر تھا حقائق کی دھوپ میں
اور ہم میں ایک شخص مقیّد ، ڈرا ہوا

ہر شخص کہہ رہا تھا ہمیں دیکھتا ہے وہ
اور ہم کہ جیسے آنکھ سے چہرہ چھپا ہوا

درد کا سلسلہ رواں ہو کوئی
زندگی میں نئی فغاں ہو کوئی

زخم دیریں تو بھرتے جاتے ہیں
اے خُدا پھر سے مہرباں ہو کوئی

دھوپ اتنی کہ روح جلتی ہے
اپنے سائے کا سائباں ہو کوئی

پاؤں میں راستے تڑپتے ہیں
کیا ضروری ہے کارواں ہو کوئی

یہ ستارے تو گِن لئے سارے
آج شب اور آسماں ہو کوئی

بال و پر میں نہاں جسارت ہے
اِن ہواؤں کا اِمتحاں ہو کوئی

جیتنا ہی کوئی قسم تو نہیں
عشق میں ہارنا بھی کم تو نہیں

منزلِ جاں رہِ عدم تو نہیں
یہ کوئی آخری قدم تو نہیں

کوئی دستک ہو اٹھ کے جاتے ہیں
دیکھنے کے لئے کہ ہم تو نہیں

وقت آیا تو رو بھی لیں گے ہم
درد اتنا ابھی بہم تو نہیں

صبح صادق مزاج ہے لیکن
شام ایسی کہیں رقم تو نہیں

رسم یہ ہے زیاں ہو سودے میں
شرط یہ ہے کہ آنکھ نم تو نہیں

دکھ کسی اور بات کا ہے ہمیں
کارِ رسوائی کارِ غم تو نہیں

سانس کیا لیتا ہے اک پتھر میں تُو
ڈھل بھی جا اب جسم کے پیکر میں تُو

شاخ پر جیسے نظر آتا نہ تھا
سج اٹھا ہے کوٹ کے کالر پہ تُو

سوچتے رہتے ہیں تنہا رات بھر
جاگتا ہوگا کہیں بستر میں تُو

نیند کیا آئے بھلا اِس فکر میں
جانے باہر ہے یا اپنے گھر میں تُو

ہجر میں بھی وصل کا ہے امتزاج
گویا اک منظر پسِ منظر میں تُو

خواب سے لتھڑے سفر کا اور ہی انداز تھا
اک مجسم آبلہ ، تکمیل کا غماز تھا

جانے کن تاریکیوں میں کھو گیا ہے ٹوٹ کر
جس ستارے پر کسی قسمت جلے کو ناز تھا

خامشی کی باولی بیوہ بھی ششدر رہ گئی
خالی منظر میں یہ کس کا چہرہ ء آواز تھا

حسرتوں کی جابجا گہرائیاں تھیں پاؤں میں
دل مگر بے بال و پر بھی مائلِ پرواز تھا

گر پڑا تھا اک سنہرا دن ہمارے ہاتھ سے
غم گزیدہ رات کا کیا سرمئی آغاز تھا

کتنے ویران مقبروں کے سانپ دامن میں لئے
اک دفینہ رتجگوں کا، دشت میں ہمراز تھا

ہوئے ہیں منتقل اس کی نظر میں
یہ میرے خواب تھے شاید سفر میں

بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے مجھ کو
اکیلی رہ رہی ہوں اپنے گھر میں

کسے میں ساتھ لے آتی چُرا کر
کوئی تھا ہی نہیں سارے نگر میں

میں اوڑھے پھر رہی ہوں اس کے پتے
عجب سی تازگی تھی اک شجر میں

لپٹ جاتی ہوں دیواروں سے اکثر
کوئی مرہم رچا ہے بام و در میں

اسے کیسے ، کہاں رکھوں چھپا کر
ملا ہے ایک لمحہ عمر بھر میں

نجانے سوچتی رہتی ہوں کیا کیا
یہ کیسے واہمے ہیں میرے سر میں

وہ میرے ساتھ کب تک رہ سکے گا
یہ ہونی کیوں ہے ان ہونی کے ڈر میں

منزلوں کی جستجو میں جا بجا کھوئے بھی تھے
راستے کے پتھروں سے لگ کے ہم روئے بھی تھے

تھک گئے تو درد میں جیسے کمی ہوتی گئی
بوجھ زخمِ آشنائی کے بہت ڈھوئے بھی تھے

ہنستے ہیں آج جو قدموں میں ٹوٹے برگ وبار
اک بریدہ شاخ سے لگ کر کبھی روئے بھی تھے

رتجگے کچھ اس طرح اس آنکھ میں رچ سے گئے
سوچتے ہیں کونسی شب تھی کہ ہم سوئے بھی تھے

کشتِ جاں میں درد کی کاٹی بھی تھی پہلی کرن
زخم کیسینے میں سورج رات بھر بوئے بھی تھے

کیوں نہیں اب تک گئے یہ اپنی پیشانی کے داغ
آبِ زمزم سے گناہوں کے بدن دھوئے بھی تھے

اُداس دِل کیلئے اہتمام کرنا تھا
ہزار حیلوں سے کچھ اِنتظام کرنا تھا

نہیں تھی زیب سرِ آئینہ شکایت بھی
کہ ایک غیر سے کیسا کلام کرنا تھا

عبث ہے دیکھنا خالی مکاں کو حسرت سے
مسافروں کو گھڑی بھر قیام کرنا تھا

تمام زخم چٹخنے لگے تھے راتوں میں
بس آنکھ تھی جسے دریا کا کام کرنا تھا

رہینِ صبحِ بہاراں تھی فصلِ چارہ گری
کمالِ صبر سے ہر دِن کو شام کرنا تھا

فقط سُراب تھا ہر موڑ ہر رفاقت کا
سفر تو دھوپ میں تنہا تمام کرنا تھا

مشکل سے بہت خود کو سمیٹا تھا ذرا سا
پھر گرد اُڑانے کو چلا آیا ہے جھونکا

کس لمس کے مضمون کا عنواں ہے حرارت
اک پھول کی حدت سے سلگتا ہے سراپا

اب تک کسی دہلیز کی آنکھوں میں نمی ہے
جاتے ہوئے آنسو کہیں اک اپنا گرا تھا

ہر ایک سحر آتی ہے اوڑھے ہوئے اک شام
ہر رات سے لپٹا ہوا ہے صبح کا دھڑکا

اِک خواب منڈیروں پہ جلا رکھا ہے ایسے
جیسے ہمیں اِک روز یہاں لوٹنا ہوگا

ہم ٹوٹتے رہتے ہیں ستارے کی طرح سے
پہنچے کبھی افلاک تلک حرفِ تمنا

تعلق مجھ سے تھا ، یہ دکھ بھی آخر سہہ گیا مجھ سے
مرا سورج مری ہی روشنی میں گہہ گیا مجھ سے

مجھے جاتے ہوئے اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا
اسے کہنا نہیں جو چاہئے تھا کہہ گیا مجھ سے

مجھے تو نیند میں چلنے کی عادت تھی سو چلتی تھی
وہ آخر ایک دن پیچھے سفر میں رہ گیا مجھ سے

بہت محفوظ رکھا تھا کسی کے واسطے میں نے
مرا وہ آخری آنسو بھی آخر ڈھ گیا مجھ سے

نجانے کونسے اک جرم کی زندہ گواہی تھا
کہیں پر کیوں لہو کا ایک دریا بہہ گیا مجھ سے

حریمِ عکسِ گہر چھونے سے پہلے
ستارہ تھا وہ سحر چھونے سے پہلے

میں قدرت کی طرح تجھ پر کھلی ہوں
مجھے محسوس کر چھونے سے پہلے

میری آغوش میں جو اجنبی ہے
یہ میرا تھا مگر چھونے سے پہلے
تنے کی خستہ حالی دیکھ لینا
مرے چاقو ؛ شجر چھونے سے پہلے

پرندہ نیند ہی میں گر پڑا تھا
مرے خوابوں کے پر چھونے سے پہلے

تھکن سے چُور ہیں کیا جانتی تھی
یہ پاؤں رہگزر چھونے سے پہلے

میں تیرے دل کی باتیں جانتی ہوں
ترا حرفِ نظر چھونے سے پہلے

میری اس دھوپ میں شدت کہاں تھی
کسی کی دوپہر چھونے سے پہلے

یہ کائنات کی وسعت بھی کس حصار میں ہے
زمین گھومتی رہتی مرے مدار میں ہے

یوں بے سکون سی راتوں میں جاگتے رہنا
عجب قرار اسی دردِ بے قرار میں ہے

نہ ماہ تاب نہ تارہ نہ خواب بھر جگنو
نہ آفتاب کوئی ، رات کے غبار میں ہے

ادب اے غم کی تجلی کو دیکھنے والے
چراغ طور مری چشمِ اشک بار میں ہے

وہ آسمان سے آخر اتر کے آئے گا
بلا کا درد مری روح کی پکار میں ہے

بڑھا جو درد تو ہم نے اسے پکارا ہے
یہ اس کا ذکر بھی کتنا بڑا سہارا ہے

عجیب ہے یہ محبت کہ اس محبت میں
ہر ایک لمحہ ء جاں جاگ کر گزارا ہے

وہ لاجورد سمندر بلا رہا ہے ہمیں
کہ نام لہروں پہ لکھا ہوا ہمارا ہے

کسی کے نقشِ کفِ پا پہ چل رہے ہیں ہم
سفر کی ساری صعوبت ہمیں گوارا ہے

لگا کہ جیسے کوئی جرم ہو گیا سرزد
اسے جو ذہن سے ہم نے کبھی اتارا ہے

پلٹ کے کوئی بتانے کبھی تو آئے گا
کہ زندگی کا کہاں دوسرا کنارا ہے

کہیں نہیں ہے محبت میں ساعتِ خوش بخت
وفا کے کھیل کا حاصل فقط خسارا ہے

بہتے ہوئے تنکوں کو سہارا نہیں کرتے
ہم موج کی وحشت سے کنارا نہیں کرتے

مشکل تو کسی طور نہیں ترکِ تمنا
خود ہم ہی بچھڑ جانا گوارا نہیں کرتے

یہ حسن سوا ہے ، ہو کوئی دیکھنے والا
بکھری ہوئی ترتیب سنوارا نہیں کرتے

حالات بدلتے نہیں جذبوں سے لگن سے
اس وہم میں دن رات گزارا نہیں کرتے

ہوتا ہے ستم اور کوئی اپنی نظر میں
ہم لوگ یونہی عشق میں ہارا نہیں کرتے

چاہو تو بصد شوق چلے جاؤ مگر ہم
جاتے ہوئے لوگوں کو پکارا نہیں کرتے

قصور وار فقط میں نہیں ہوں لغزش میں
مرے خلاف مرے خواب بھی تھے سازش میں

میں ڈھلتی جاتی ہوں ، کندن میں ڈھلتی جاتی ہوں
گھلا ہے کیسا یہ تیزاب غم کی بارش میں

اب اُڑتی راکھ خیالوں پہ جمتی جائے گی
جلا رہی ہوں مراسم شعور ِ آتش میں

بھنور میں تھی تو زمانے کو کام تھے کیا کیا
کنارے پر بھی ہیں مصروف سارے پرسش میں

مثال باد ِ صبا ہوں چلوں تو چلتی رہوں
مکاں نہیں ہے سخن ڈوریوں کی بندش میں

مجھے خوشی ہے مرے جیسا کوئی اور بھی ہے
کوئی تو جاگا رہا ہے کسی کی خواہش میں

درد اک گریہ پیہم میں بدل جاتا ہے
اور پھر زخم کے مرہم میں بدل جاتا ہے

وقت چُبھتا ہے کسی کھردرے کپڑے کی طرح
تُو چلا آئے تو ریشم میں بدل جاتا ہے

میری اِس درجہ اُداسی سے پریشان نہ ہو
غم کسی کا ہو مرے غم میں بدل جاتا ہے

عمر کا ساتھ بھی کیا ساتھ ہے اِک غیر کے ساتھ
ساتھ مٹی کا یونہی دم میں بدل جاتا ہے

مل ہی جاتے ہیں بہانے مجھے رونے کیلئے
ہر تبسم نئے ماتم میں بدل جاتا ہے

روز آئینے میں اُترا ہوا میرا چہرہ
ایک جاتے ہوئے موسم میں بدل جاتا ہے

دن کو جلتے ہوئے سورج میں رہا کرتی ہوں
شب کو پیکر کسی شبنم میں بدل جاتا ہے

بدلتی ساعتیں ڈھلنے لگی ہیں سالوں میں
ہنوز تیرہ شباں منجمد اجالوں میں

بھٹکتے رہنا ہے اک خواب کی تمنا کو
کبھی خیال سے باہر کبھی خیالوں میں

مجھے زمان و مکاں کی گرفت سے باہر
قیام کرنا ہے تاریخ کے حوالوں میں

کسی جواب کے وحشت زدہ تکلم سے
کبھی تو گفتگو اپنی بھی ہو سوالوں میں

یہ دشتِ ذات کی تنہائیاں اثاثہ ہیں
عجب کشش ہے شبِ ہجر کے غزالوں میں

شکستِ جاں کا سفر روشنی کا سرچشمہ
چراغ کتنے فروزاں ہیں دل کے چھالوں میں

ایک انجانی اُمید و بیم کی دلدل میں ہیں
گاہے شہرِ زندگی میں گاہے ہم مقتل میں ہیں

ہم سے ہی پیوند میں لپٹی ہے ناموسِ حرم
دیکھنا چاہو تو ہم پوشاک کی مخمل میں ہیں

تم جلا دو گے تو خوشبو میں بدلتے جائیں گے
ہیں کبھی لوبان میں زندہ کبھی صندل میں ہیں

وہ گلی شاید کہیں پیچھے سفر میں رہ گئی
بیچ میں بستی کے لگتا ہے کسی جنگل میں ہیں

اپنی آگاہی برہنہ سر نہ کردے دھوپ میں
یا الٰہی خیر ہم عرفان کے آنچل میں ہیں

کبھی تو رات بھی حلیہ بدل کے آجاتی
گلال وصل کا چہرے پہ مل کے آجاتی

مجھے بتا کے جو آتے تو آدھے رستے تک
میں فرطِ شوق میں گھر سے نکل کے آ جاتی

مجھے کہاں کوئی سیلاب روک سکتا تھا
بلایا ہوتا تو پانی پہ چل کے آ جاتی

حصارِ ذات سے نکلے نہیں ہو تم ورنہ
میں اپنے آپ سے باہر مچل کے آ جاتی

مجھے جو سوچتا سوکھا اداس پتا کہیں
میں شاخ شاخ بہاروں میں ڈھل کے آجاتی

تم اپنی پیاس میں مجھ کو تلاش تو کرتے
مثالِ آب زمیں سے اُبل کے آ جاتی

گرچہ شکوہ بہت ہی ذاتی ہے
مسئلہ میرا کائناتی ہے

ایسا لگتا ہے ایک میرے سوا
ساری دنیا کو نیند آتی ہے

باندھ رکھتی ہوں اپنے پلو میں
ہر خوشی بھاگ بھاگ جاتی ہے

منظروں کا طلسم اپنی جگہ
مجھ کو بے منظری بلاتی ہے

ان کہی بات ہے کہیں کوئی
یہ جو پتوں میں سرسراتی ہے

نام سے جس کے بدن میں جھرجھری آتی رہی
وقت یہ آیا کہ اس کی یاد بھی جاتی رہی

یوں خزاں کی چیونٹیاں چمٹیں زمیں کی کوکھ سے
فصلِ گل بے چین سی راتوں میں چلاتی رہی

ایک نقطے پر ملے احساس کے سب زاویے
دائرہ میں درد کی تصویر لہراتی رہی

اُس نظر کی دھوپ کا لکھنا پڑا ہے مرثیہ
عمر بھر جو منجمد سوچوں کو پگھلاتی رہی

منزلِ شہرِ تمنا دسترس میں تھی مگر
آرزو کو راستے میں نیند آ جاتی رہی

اس طرح جاڑا کوئی لپٹا رہا کہ عمر بھر
گرم پانی سے بھری بوتل کو سہلاتی رہی

دوا غم کی مجھے بازار لائی
میں چیزوں کے اٹھا انبار لائی

اذیت میں کہاں تک خود کو رکھتی
گلی سے اک پرندہ مار لائی

کسی ناکام قصے سے چرا کر
کہانی مرکزی کردار لائی

میں پھر صحرا سے چہرے پر سجا کر
چمکتی ریت کا سنگھار لائی

کوئی سائے میں آ بیٹھا ہے میرے
کہاں سے چھاؤں یہ دیوار لائی

بھنور پہنے ہوئے جو مضطرب تھا
وہ دریا ساحلوں سے پار لائی

ابھی گزرے دنوں کی کچھ صدائیں شور کرتی ہیں
دریچے بند رہنے دو ، ہوائیں شور کرتی ہیں

یہی تو فکر کے جلتے پروں پہ تازیانہ ہے
کہ ہر تاریک کمرے میں دعائیں شور کرتی ہیں

حصارِ اسمِ اعظم کھینچنے والے کا کہنا تھا
یہاں آسیب رہتے ہیں بلائیں شور کرتی ہیں

ہمیں بھی تجربہ ہے بے گھری کا چھت نہ ہونے کا
درندے ، بجلیاں ، کالی گھٹائیں شور کرتی ہیں

ابھی گردِ سفر کے گریے کی ہے گونج کانوں میں
ابھی کیوں منتظر خالی سرائیں شور کرتی ہیں

خدا کا شکر ہے اس نے ہمیں سیراب رکھا ہے
جہاں بنجر زمینیں ہوں انائیں شور کرتی ہیں

سفر کی گرد گھر تک آ گئی ہے
دریچوں پر بہت مٹی جمی ہے

اندھیرے میں نظر آتا ہے مجھ کو
مرے اندر یہ کیسی روشنی ہے

طوالت شام کی مت پوچھ مجھ سے
ابھی تک آسماں پر ''لالگی'' ہے

میں اب تو نیند میں چلنے لگی ہوں
سفر کی ایسی عادت ہو گئی ہے

میں پھر اپنا سمجھ بیٹھی ہوں اس کو
مری دانستہ پھر اک خودکشی ہے

معمے حل کہاں ہوتے ہیں مجھ سے
فقط تنہائی کی خانہ پری ہے

میسر ہے ہر اک سوغات مجھ کو
مگر پھر بھی کہیں کوئی کمی ہے

گزر رہا ہے رفاقت کا سانحہ مجھ پر
ہے مہربان بہت آج کل خدا مجھ پر

میں ایک صرف شدہ لمس چھوڑ آئی ہوں
کسی پرانے تعلق کا بوجھ تھا مجھ پر

مری اکائی میں رہتا تھا اک زمانے سے
ہوا ہے منکشف مجھ میں جو دوسرا مجھ پر

دکھائی دینے لگا ہے سفر سے آگے بھی
کھلا ہے کیسا اچانک یہ راستہ مجھ پر

ہوا چمکنے لگی یوں بدن سنہرا ہوا
یہ کون سونے کا پانی چڑھا گیا مجھ پر

رکھے ہیں خواب بھی گروی مگر چکا نہ سکی
عجیب قرض کہ تھے واجب الادا مجھ پر

بدن میں کیسے یہ خوشبو بھرے گلاب کھلے
کہ خشک پتے گرانے لگی ہوا مجھ پر

اترتی جاتی ہے مٹی میں میری پیشانی
عجیب سلسلہ سجدوں کا ہے روا مجھ پر

یہ کون ان دنوں پہچان بن گیا ہے مری
یہ کس نے نام کا کتبہ لگا دیا مجھ پر

اینٹ پتھر اُٹھا کے لاتی ہوں
کتنی پاگل ہوں گھر بناتی ہوں

اُس کے رکھے ہوئے ہیں ڈھیروں نام
اُس کو ہر نام سے بلاتی ہوں

خواب کھو جاتے ہیں اندھیرے میں
میں کہاں بتیاں بجھاتی ہوں

گھر سے جاتی ہوں یاد سے ہر روز
روز بھولے سے لوٹ آتی ہوں

آسماں میں شگاف بھی ہوں گے
اس توقع پہ شب بتاتی ہوں

اپنے ہی ناخنوں سے چھیلا ہوا
زخم مرہم سے بھرتی جاتی ہوں

اُلجھنیں اُنگلیوں میں اُلجھی ہیں
بار بار اِک گرہ لگاتی ہوں

خرچ اس سے کہیں زیادہ ہے
سال میں جس قدر کماتی ہوں

آنکھ میں دم توڑتی خواہش نئی کھینچی ہوئی
حسرتوں کی دار پر ہے زندگی کھینچی ہوئی

رات کے تاریک پردے پر چلا کرتی ہے وہ
انتظارِ وصل کی ساعت کوئی کھینچی ہوئی

دھوپ میں کیوں جھلملاتی ہے ہوا کے دوش پر
میرے دوپٹے پہ کوئی پھلجھڑی کھینچی ہوئی

بجھتے رنگوں سے تراشی میں نے خود شامِ فرق
میرے ہاتھوں میں لکیریں ہیں مری کھینچی ہوئی

دور تک ڈھانپا ہوا تھا برف سے یوں راستہ
انتظاروں کی کوئی تصویر سی کھینچی ہوئی

جانے کس بہروپ کا پردہ اٹھا تھا نیند میں
خواب تھا یا شکل کوئی خوف کی کھینچی ہوئی

دم گھٹا جاتا تھا ۔ اتنا حبس تنہائی میں تھا
اور سینے میں فقط اک سانس تھی کھینچی ہوئی

میرے کمرے میں اتر آئی ہے کھڑکی کھول کر
آسماں سے آئینے تک چاندنی کھینچی ہوئی

اک سنہرے چوکھٹے میں ہلتی ہے میرے ساتھ
شکل اس کے ہاتھ کی اک سرسری کھینچی ہوئی

ملی ہے پھول کے شاید جواب میں تتلی
کسی نے بھیجی ہے رکھ کر کتاب میں تتلی

یہ دل دھڑکتا ہے تعبیر کے اندیشے سے
بھٹکتی پھرتی ہے برسوں سے خواب میں تتلی

پروں میں ہو گیا پیوست خار کا خنجر
اٹک کے رہ گئی سوکھے گلاب میں تتلی

نظر سے رنگ کا پردہ اُٹھے تو چاروں طرف
نفس سراب ہے اور ہر سراب میں تتلی

کھلا تھا کھاتہ تمنا کے موسموں کا کوئی
سنا ہے آئی ہے میرے حساب میں تتلی

ہے خوشبوؤں کے تعاقب کا اختتام کہاں
مری طرح سے ہے کتنے عذاب میں تتلی

ہر ایک رنگ کے پیچھے ہے اور رنگ کوئی
ہے کائنات کے شاید نقاب میں تتلی

زخم ہوں کوئی ، گلتے گلتے تھک جاتی ہوں
اپنے جسم میں پلتے پلتے تھک جاتی ہوں

کیسا تاسف ہے کہ ختم نہیں ہو سکتا
ان ہاتھوں کو ملتے ملتے تھک جاتی ہوں

میرے پاؤں میں ہے اونچی ہیل کا جوتا
پنجوں کے بل چلتے چلتے تھک جاتی ہوں

رک جاتی ہے روز کوئی انجانی ساعت
عمر ہوں میں اور ڈھلتے ڈھلتے تھک جاتی ہوں

راکھ سلگتی رہتی ہے اعصاب میں کوئی
رات گئے تک جلتے جلتے تھک جاتی ہوں

رستوں کی پُر فریب ڈگر سے نکل پڑے
تنگ آ کے دائروں کے سفر سے نکل پڑے

اندر کا حبس ایسی بغاوت سکھا گیا
ہم بھی ہوا کے واسطے گھر سے نکل پڑے

اب کے یہ فیصلہ تھا کہ ہم ڈوب جائیں گے
کتنے کنارے ایک بھنور سے نکل پڑے

ہم کو پہن کے ٹہنیاں سرسبز ہو گئیں
پھر تازہ زخم سوکھے شجر سے نکل پڑے

جس خواب کا طلسم کبھی ٹوٹتا نہ تھا
اک رتجگے میں اس کے اثر سے نکل پڑے

زباں سے حرف شرماتے نہیں ہیں
بس ہم جملہ بنا پاتے نہیں ہیں

ادھوری خواہشوں کا کیا ہوا ہے
ہمیں اب خواب کیوں آتے نہیں ہیں

نظر اُکتا گئی ہے منظروں میں
دھنک کے رنگ اِتراتے نہیں ہیں

عجب دھڑکا سا جالا بن گیا ہے
یہ کیسے وہم ہیں جاتے نہیں ہیں

فلک بھی دور ہوتا جا رہا ہے
ہم اپنے پر بھی پھیلاتے نہیں ہیں

تہہ در تہہ کیا جمتا لاوہ آگ بگولا پتھر میں
مٹی بھن کر چیخ گئی وہ آنچ تھی میرے پیکر میں

خوابوں کے ویران جزیرے دھوپ بھنور میں ڈوب گئے
باہر ہے اک ریت کا صحرا اور سمندر اندر میں

ڈر ڈر کر بھی لوٹ آتی تھی ، کتنی بہادر ہوتی تھی
جھولتا تھا آسیب زدہ جانی کا اک پردہ گھر میں

ایک حقیقت کے ملبے سے روز نکل کر آتا ہے
شکل بدلتی تنہائی کا بوڑھا ڈھانچہ بستر میں

آنکھوں کے طرف میں جھریاں جال بچھائے بیٹھی ہیں
کب ٹپکے گا آخری لمحہ اک لافانی منظر میں

ہیں ترے انداز ، اپنی خُو ہے کوئی کیا کرے
ہم یہاں تنہا ، وہاں پر تُو ہے کوئی کیا کرے

بن سنور کر دیکھتے ہیں سرمئی کاجل مگر
آئینے کی آنکھ میں آنسو ہے کوئی کیا کرے

ایک "حرفِ کُن" سی سادہ تو نہیں ہے زندگی
خاک میں پھیلا ہوا جادو ہے کوئی کیا کرے

سوچتے ہیں اب سلگ اُٹھیں کہ ہم جلنے لگیں
دھوپ ہے باہر تو اندر لُو ہے کوئی کیا کرے

پیاس کا ہے طاق اور بجھتا دیا امید کا
پاؤں زخمی ، فاصلوں پہ جُو ہے کوئی کیا کرے

خشک ٹہنی پر کِھلا ہے آشنائی کا گلاب
کب چھپانے سے چھپی خوشبو ہے کوئی کیا کرے

ہم اکیلے ہوں اگر تو نیند بھی آنے لگے
تُو بھی تو اطراف میں ہر سُو کوئی کیا کرے

کوئی حسرت کسی وحشت سے مچل جاتی ہے
روز جگنو کے تعاقب میں نکل جاتی ہے

وقت نے اس طرح کوہسار نمائی دے دی
مجھ پہ جو چیز بھی گرتی ہے پھسل جاتی ہے

اژدھوں کے کئی ریوڑ مرے اطراف میں ہیں
رینگتی بھیڑ اُمنگوں کو نگل جاتی ہے
روز لاتی ہے نیا گھر کسی گُڑیا کے لئے
کیسی لڑکی ہے کھلونوں سے بہل جاتی ہے

اپنی دہلیز پہ برسوں سے کھڑی سوچتی ہوں
کونسی راہ سوئے تاج محل جاتی ہے

کتنا جاگوں میں اُجالوں کی طوالت کے لئے
نیند آتی ہے تو تاریخ بدل جاتی ہے

پھیل جاتی ہے چمکتے ہوئے پانی کی طرح
برف پر گرتی ہوئی دھوپ پگھل جاتی ہے

دیکھ کر تیز ہوا کا لب و لہجہ اکثر
جسم کی اوڑھنی دیوار میں ڈھل جاتی ہے

ربط کا حسنِ سبب ، کام ہی رہ جاتا ہے
دیس ہجرت میں فقط نام ہی رہ جاتا ہے

جس کے پاؤں سے نکل جاتی ہے مخمور زمیں
ہاتھ میں چاند لئے خام ہی رہ جاتا ہے

چند سونے کے نوالوں کی تگ و دو کے طفیل
دسترس سے پرے آرام ہی رہ جاتا ہے

گھر بناتے ہوئے پردیس کو اپناتے ہوئے
حاصلِ عمر تو بس دام ہی رہ جاتا ہے

جب مرے ہاتھ کہیں اور سحر کاشت کریں
پھر وطن باعثِ الزام ہی رہ جاتا ہے

بین مٹی کے جگا دیتے ہیں سوتے سوتے
آنکھ میں شور کا ہنگام ہی رہ جاتا ہے

جو بچھڑ جاتا ہے سورج وہ محاذِ شب پر
کام آ جاتا ہے ناکام ہی رہ جاتا ہے

خاک جب زخم کے بھرنے کی دوا کر نہ سکے
روح میں نغمہ ء دشنام ہی رہ جاتا ہے
ٹوٹتے رہتے ہیں جو ڈار سے اُن کا آخر
پر کٹی کونج سا انجام ہی رہ جاتا ہے

ماں ہی سے نسب کی پہچان ہے ورنہ آدم
نام ہوتے ہوئے بے نام ہی رہ جاتا ہے

روز ہجرت سہی سرحدِ اُفق پر لیکن
دِن کا چہرہ لہو آشام ہی رہ جاتا ہے

کروٹیں لیتا ہے اندر کہیں اپنا ماضی
کہنے کو صورتِ ابہام ہی رہ جاتا ہے

یاد آئے جو چراغاں مری گلیوں کا مجھے
چاند کا داغ سرِ بام ہی رہ جاتا ہے

اور ہونگے جنہیں دریوزہ گری آتی ہے
ہم زمانہ ہیں ہمیں لمحہ گری آتی ہے

ہم لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بھی کہہ سکتے ہیں
ہم تو وہ ہیں کہ جنہیں کوزہ گری آتی ہے

چاک ہی چاک ہیں بس چاک گریبانی میں
کس سے پوچھیں کہ کسے بخیہ گری آتی ہے

خود کتابوں سے نکل آتی ہیں سوکھی پتیاں
ہم سے کہنے کہ ہمیں غنچہ گری آتی ہے

ہجر کی آگ نے پہچان جلا ڈالی ہے
ہے کوئی ایسا جسے چہرہ گری آتی ہے

سو چھپانے پہ بھی حالات جھلک اٹھتے ہیں
اشک در اشک انہیں جلوہ گری آتی ہے

سادگی شیوہ ء اربابِ وفا ہے ورنہ
چشمِ خاموش کو بھی فتنہ گری آتی ہے

زخم پہلے تھے سو اب اور نئے گھاؤ بھی ہیں
ہم نے سمجھا تھا اُسے چارہ گری آتی ہے

درد اٹھتا ہے تو ہنس دیتے ہیں بہلانے کو
کب قرینے سے ہمیں نوحہ گری آتی ہے

کون دیکھے یہ چمکتا ہوا ریزہ ریزہ
کون ایسا ہے جسے شیشہ گری آتی ہے

اپنا سچ گھومتا رہتا ہے کہانی بن کر
ورنہ ہم سوں کو کہاں قصہ گری آتی ہے

خواب دے دیتے ہیں قیمت نہیں لیتے اُن کی
ہم سے سادوں کو بھی کچھ سودہ گری آتی ہے

زندگی سرمئی نوحے سے نکلتی ہی نہیں
ورنہ ہم وہ ہیں جنہیں نغمہ گری آتی ہے

آنکھ کی بستیاں آباد نہیں رہ سکتیں
اپنے دریا کو عجب فتنہ گری آتی ہے

ذرا سی عمر میں بھاگے بہت ہیں
کہ ہم رفتار سے آگے بہت ہیں

میسر ہی نہ تھا سونے کا موسم
ہمیں معلوم ہے جاگے بہت ہیں

نجانے درد کیوں ہوتا نہیں ہے
بظاہر زخم تو لاگے بہت ہیں

کسی لمحے کو ان سے باندھ لیں گے
ہمیں ٹوٹے ہوئے دھاگے بہت ہیں

کوئی پھر لاش کیا باہر پڑی ہے
گلی کے موڑ پر کاگے بہت ہیں

اذیت ناک تھا اپنا تعارف
ہم اپنے آپ سے بھاگے بہت ہیں

آگ بہنے لگ گئی ہے ہجر کی تنگ ناؤں میں
برف جمتی جا رہی ہے آنکھ کے صحراؤں میں

بس سرابوں کے مناظر چل رہے ہیں ساتھ ساتھ
دشت کیوں تجسیم ہوتا جا رہا ہے پاؤں میں

لمحہ ء موجود کی مریم کا گریہ مجھ میں یوں
جیسے حسرت بے کسی میں ، بیوگی بیواؤں میں

دیکھتے کیا ہو بدن کا کوئلہ جلتا ہوا
دھوپ ملتی جا رہی ہے رفتہ رفتہ چھاؤں میں

اُس کی لٹیا بھی سنا ہے بہہ گئی پانی کے ساتھ
وہ جو میرا نام لیتا تھا ابھی تک گاؤں میں

میری سب طغیانیاں لے کر سنبھلتے کس طرح
زندگی ! سیلاب آنا تھا ترے دریاؤں میں

کیوں نظر آتی نہیں ہیں خال و خد کی کرچیاں
میں نے تو بانٹے ہمیشہ آئینے بیناؤں میں

مری جان اٹھ کے نہ جا ابھی مرا دل بہت ہی اداس ہے
مری آنکھ میں تری دید کی ذرا بجھ تو لے یہ جو پیاس ہے

میں سنگھار کر کے دلہن بنوں لئے رنگ تیرے وصال کے
کہ یقین کچھ تو مجھے بھی ہو، تو قریب ہے مرے پاس ہے

ترا حرف ، حرف ہوآخریں ذرا لب کشا تو ہو دلنشیں
مجھے رکھ گرفت ِ فریب میں ترا جھوٹ بھی مجھے راس ہے

بنیں قربتوں کی ضمانتیں ، تری فرقتوں بھرے رتجگے
پسِ چشم خشک نگاہ کر کہ تو لیک چہرہ شناس ہے

مری زندگانی ہے تو اگر تو قیام مرے بدن میں کر
ترے لمس سے ہو شکن شکن ، مرے تن پہ جو بھی لباس ہے

مجھے اعتبارِ نظر نہیں تجھے دیکھتی ہوں ٹٹول کے
مجھے وہم کیسا عجیب ہے ، مرے دل میں کیسا قیاس ہے

کِس رخنے سے کیسی خموشی در آئی تھی
ہم دونوں کے بیچ ہماری تنہائی تھی

اِک کاندھے پر بُجھتی رات کے چاند کا دُکھ
اور دوجے پر یادِ مِلن کی گہنائی تھی

رنگ بھرے کچھ زخم ہتھیلی پر آنے تھے
ہاتھ کو شیشے کی چوڑی جو پہنائی تھی

شب کی آنکھیں تاروں سے بھر آئی تھیں
دِل میں لیک تمنا جیسی پروئی تھی

بے موسم اِک سُرخ گلاب نکل آیا تھا
جب پتھر پر بوند لہو کی ٹپکائی تھی

کِتنے پرندے چونچ میں کنکر لے آئے ہیں
پسپائی میں سورت کوئی دُہرائی تھی

کسی گزند کا اکثر قیاس رہتا ہے
دِل شکستہ بہت بد حواس رہتا ہے

شفق کی چُٹکی کا تحفہ کسی نے بھیج دیا
کہیں پہ کوئی تو چہرہ شناس رہتا ہے

ہزار رنگ کی ٹیسیں شکن شکن میں ہیں
بدن پہ مدّ کا پہروں لباس رہتا ہے

دِکھائی دیتی ہیں بادل میں اشکبار آنکھیں
مرے لئے بھی کوئی تو اُداس رہتا ہے

سنائی دیتی ہے کِس کے بدن کی سرگوشی
یہ کون ہے جو مرے آس پاس رہتا ہے

یہ انتہا بھی شوق کے عالم میں دیکھ لے
پیوستہ خار قطرہ ء شبنم میں دیکھ لے

ہر زخم ہے بہار کی زد میں کھِلا ہوا
تاثیر اپنے لمس کے مرہم میں دیکھ لے

ہونے کو روتے روتے سحر ہوگئی مگر
آنکھیں چلی گئی ہیں ترے غم میں دیکھ لے

پانی میں تیرتے ہیں ترے جیسے خد و خال
تصویر اپنی دیدہ ء پُر نم میں دیکھ لے

اشکوں میں تر بتر بھی سُلگتے رہے چراغ
یہ بھی تضاد رشتہ ء باہم میں دیکھ لے

الزامِ اختصارِ سفر آبلوں پہ کیا
تازہ درازِ خواہشِ پیہم میں دیکھ لے

خوشبو بجھی بجھی سی ، ہوا سوختہ سخن
کیا کیا بدل بدل گیا موسم میں دیکھ لے

کیا آخری چراغ بجھاتے ہوئے کہوں
میں جا رہی ہوں یہ کسے جاتے ہوئے کہوں

اب کے بہار سُرخ گلابوں کی آئے گی
ہر زخم اپنے دِل پہ لگاتے ہوئے کہوں

ہجرت مکاں سے گھر کی طرف بس مشقتیں
کاندھوں پہ آسمان اُٹھاتے ہوئے کہوں

لہجے کے زعفران میں تعویذ نہ ملا
دانستہ بات بات میں آتے ہوئے کہوں

پہلے بھی کٹ چکی ہے اسی دائرے میں رات
زنجیر حلقہ حلقہ سجاتے ہوئے کہوں

کتنا ہوا ہے طے مرا اس کی طرف سفر
اس کی طرف سے لوٹ کے آتے ہوئے کہوں

اپنے کہے سے میں نے مُکرنے دیا اسے
جینے مجھے نہ دیتا تھا مرنے دیا اسے

وہ بھی رکا نہیں مری وحشت سرائے میں
میں نے بھی راستے سے گزرنے دیا اسے

چلتا تھا آندھیوں کو جلو میں لئے ہوئے
جذبوں کی گرد تھی سو بکھرنے دیا اسے

اُس چاند پر تھیں رات کی آنکھیں لگی ہوئیں
کچے مکاں کی چھت پہ اُترنے دیا اسے

وہ چاہتا تھا میری محبت کی بارگاہ
سجدہ نمازِ شوق کا کرنے دیا اُسے

صحرا کر ڈھانپنے کی تمنا سے بھر گیا
سایہ ذرا جو میرے شجر نے دیا اسے

آدھا کُھلا ہوا تھا کسی انتظار میں
دستک کا حوصلہ بھی تو در نے دیا اسے

ابر ہے، بادِ نو بہاری ہے
ہر ہوا غیر اختیاری ہے

ایسے بکھرے کہ پھر نہیں سمٹے
لاکھ ترتیبِ جاں سنواری ہے

اس نے خود ہی ہمیں گزار دیا
زندگی ہم نے کب گزاری ہے
عادتاً خوش مزاج ہیں ورنہ
زخمِ تازہ بھی زخمِ کاری ہے

پھر گرفتار ہوگئے خود ہی
پھر نئی جنگ ہم نے ہاری ہے

کل بھی کیسا پہاڑ سا دن تھا
آج کا دن بھی کتنا بھاری ہے

چلیں آندھیاں وہ نصیب کی ، کئی کہسار ملے نہیں
وہ جو بزمِ یار کی جان تھے سرِ کوئے یار ملے نہیں

سبھی شہرِ دل کی صعوبتیں فقط ایک جاں پہ گزر گئیں
کبھی چارہ ساز چلے گئے، کبھی غم گسار نہیں ملے

وہ جو رت بھر کے چراغ تھے وہ سحر کی آنکھ میں گل ہوئے
سرِ انتظار جلائے تھے پسِ انتظار ملے نہیں

وہ جو حرف حرف تھے آخریں نہیں آنسوؤں نے مٹا دیا
وہ جو قول تھے جو قرار تھے ہمیں بے قرار ملے نہیں

جہاں شاخ شاخ تراش دی تری سبزسبز نوید میں
ترے خار خار وصال میں وہی مرغزار ملے نہیں

وہی ساتھ ساتھ تھے راستے کبھی کھو گئے کبھی مِل گئے
جو دعا بھرے ہوئے ہاتھ تھے وہی بار بار ملے نہیں

اِک لو بھی آزر تھا آزر کے پیچھے
پھر ہاتھ شناسا تھا نئے ور کے پیچھے

آنکھوں کے دِلاسے کے لئے جھانک لیا تھا
معلوم تھا کوئی نہیں دیوار کے پیچھے

رُکتی ہوئی دھڑکن کو کئی کام تھے شاید
تھا کون دلِ بےسر پیکار کے پیچھے

کیوں صبحِ وفا خوفزدہ تھی کسی شب سے
اِک ضبط کا آنسو بھی تھا انکار کے پیچھے

ہوتے ہی نہیں پھول یونہی سرخ لہو سے
کچھ زخم بھی ہوتے ہیں نہاں خار کے پیچھے

ہم خانماں برباد حقائق سے گریزاں
پندار کے آگے کبھی پندار کے پیچھے

یہ زندگی کا قرینہ ہمیں جو آیا ہے
ترے ملال نے یہ بھی ہنر سکھایا ہے

لب اس سے بڑھ کے کوئی اور معجزہ کیا ہو
بجھا چراغ ہواؤں نے خود جلایا ہے

تھی ایک خواب کو دفنا کے نوحہ گر جو آنکھ
نہ پوچھ کیسے اُسے قبر سے اُٹھایا ہے

پڑی ہوئی ہے دراڑوں کی دھوپ چہرے پر
کہ آئینے پہ کسی زلزلے کا سایا ہے

کٹھن تھا مرحلہ کڑیوں کو جوڑنے کا بہت
سرے سے کس نے یہ آکر سرا ملایا ہے

جو تم نہیں تو تمہارا خیال ہی رہتا
گمانِ وصل کا شرحِ وصال ہی رہتا

کسی سبب تو کوئی زندگی کہیں ہوتی
خوشی نہیں تھی تو حزن و ملال ہی رہتا

ہمیں تو کرچیاں چننی پڑی ہیں پلکوں سے
برا ہی کیا تھا کہ شیشے میں بال ہی رہتا

بجھی بجھی ہوئی صبحِ وفا سے بہتر تھا
شبِ فرق کا جاہ و جلال ہی رہتا

یہ شام آنکھ کو اکسا رہی ہے کہنے پہ
افق پہ صرف مقامِ زوال ہی رہتا

یہ کیوں جوب کی وحشت سرا میں لے آیا
مقیم دل ہی میں رہتا ، سول ہی رہتا

تیرہ شبی ہے میرے دیاروں کی کھوج میں
خاموش دِل گرفتہ نظاروں کی کھوج میں

آئینہ ءِ خیال ہے گردش میں رات دِن
شیشہ ہے جیسے عکس نگاروں کی کھوج میں

ب رفتہ رفتہ جلنے کی عادت سی ہوگئی
نکلی ہوں گھر سے تازہ شراروں کی کھوج میں

پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے گرنا جنہیں پڑا
پھرتے ہیں آسماں اُنہی تاروں کی کھوج میں

آتی نہیں فلک سے کوئی نور کی لکیر
آنکھیں ہیں نیم باز اشاروں کی کھوج میں

گُذری رُتوں کا قرض ہیں سوکھے ہوئے گلاب
گم گشتہ موسموں کے مزاروں کی کھوج میں

جو اپنے ساتھ رہا تھا وہ اور تھا کوئی
وہ جس نے ساتھ دیا تھا وہ اور تھا کوئی

بسا ہوا ہے یہ لمحہ تڑپ کی خوشبو میں
جو آنسوؤں سے بھرا تھا وہ اور تھا کوئی

ہماری آنکھ میں برسوں کی حسرتوں کا چراغ
وہ جس نے دیکھ لیا تھا وہ اور تھا کوئی

ہزار چاک گریبانیوں میں بھی جس نے
رفو کا کام کیا تھا وہ اور تھا کوئی

وہ اور تھا کہ جو خوش تھا تمہاری خواہش سے
جو مجھ میں رونے لگا تھا وہ اور تھا کوئی

اُسی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں لیک چہرے میں
جو مسکرا کے مِلا تھا وہ اور تھا کوئی

فردیات

اس زندگی میں یوں تو جھمیلے بہت رہے
ہم سب کے درمیان اکیلے بہت رہے

ہم چمکتے رہے کرن کی طرح
اس کی باتیں بہت سنہری تھیں

مری مثال کہ میں اجنبی زباں کی کتاب
تمہارے چھونے سے ہوتا ہے ترجمہ جس کا

لہرا گیا ہے ذہن میں پھر لمس کا خیال
پھر جسم میں عجیب سی اک جھرجھری ہوئی

عذابِ جاں ہے یہ آنکھوں میں کاٹنا راتیں
مرے لئے کوئی جاگے کبھی خدا نہ کرے

میں اسے دوش نہ دوں کیسے کمالِ فن پر
وہ مجھے چھوڑ گیا ہے بڑی آسانی سے

پھر ستاروں سے آنکھ بھر ہی گئی
آج کی رات بھی گزر ہی گئی

کواڑ کھول کے رکھتی ہوں اپنی پلکوں کے
کہ خواب آئیں تو دستک نہ دے کے آیا کریں

مری زمین کو جلنے دیں دھوپ میں اپنی
یہ آسمان کہیں اور جا کے سایہ کریں

میں منتظر ہوں بہت دیر سے کسی کی مگر
خبر نہیں کہ مجھے انتظار کس کا ہے